تبسم کاشمیری *

اُردو تحقیق کا ابتدائی دور (سر سید احمد خان)

انیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو ادب بہت سی تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ۱۸۷۴ء میں لاہور کی انجمن پنجاب سے جدید شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوا جس کے دوررس نتائج نے اردو شاعری کی کایا کلپ کردی۔ مناظرِ فطرت، موسموں اور حبِ وطن کی نظموں کے جس سلسلہ کا آغاز ہوا تھا بیسویں صدی کے آخر میں اس کا ثمر اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کی صورت میں برآمد ہوا تھا۔ اردو کا پہلا ناول خطِ تقدیر مولوی کریم الدین نے ۱۸۶۷ء میں لاہور شہر میں لکھا تھا مگر اردو کے شاہکار ناولوں کا سلسلہ انیسویں صدی کے ربعِ آخر میں لکھنو سے شروع ہوا تھا۔ فسانۂ آزاد، سیرِ کہسار، جامِ سرشار، فردوس بریں اور امراؤ جان ادا جیسے ناول بھی اسی دور میں لکھے گئے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں آب حیات جیسی کتاب شائع ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے ربع آخر ہی میں جدید اردو تحقیق کے نقوش بھی نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ اس زمانے میں محدود پیمانے پر تحقیق کے اصولوں پر بحث کرنے کا آغاز بھی ہوا اور عملی تحقیق کے نمونے بھی تیار ہوئے۔ سرسید، شبلی، آزاد اور حالی کی سرگرمیوں سے تحقیق کا کام ابتدائی طور پر شروع تو ہوا مگر یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری نہ رہ سکا۔ یہی دور اُردو تحقیق کا ابتدائی دور ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ جس میں ادبی تحقیق پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ آزاد کی آب حیات کے علاوہ ادبی تحقیق کے میدان

میں مشکل ہی سے کوئی مثال مل سکے گی۔ اس عہد میں ادبی تحقیق کا واحد نمونہ آب حیات ہی ہے۔ اگر چہ آب حیات پر محققوں نے بہت اعتراضات کیے ہیں۔ مگر ان کے باوجود آب حیات کو اردو تحقیق کا ابتدائی نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ آزاد نے اپنی طرف سے کہانیاں بنائی ہیں یا غیر مصدقہ حقائق سے رجوع کیا ہے۔ ان مسائل کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں اس مقالے کے دوسرے مباحث میں ہم اصل حقائق بیان کریں گے۔ فی الحال اس ابتدائی دور کے بارے میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ یہ تاریخ کا دور تھا اور اس زمانے میں تاریخ کی تحقیق پر زیادہ توجہ دی جارہی تھی۔ بزرگانِ تاریخ کی سوانحات پر کتابیں تصنیف کی جارہی تھیں اور ہندوستان میں مسلم تہذیب وتمدن پر تحقیق کی جارہی تھی۔ سوانحات کا کام شبلی اور حالی نے کیا اور اردو میں مثالی سوانح عمریاں تصنیف کیں۔ تہذیب وتمدن اور آثار قدیمہ پر سرسید نے شاندار کام کیا اور اس کے ساتھ ساتھ بعض اہم تاریخی کتب کی تدوین بھی کی۔ ہم اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سرسید نے آثار قدیمہ اور تاریخی کتب کی تدوین کا کام انیسویں صدی کی ربع صدی سے پہلے سرانجام دیا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو میں تاریخی تحقیق کا آغاز سرسید نے کیا تھا۔

یہ بہادر شاہ ظفر کا زمانہ تھا۔ دلی کے سیاسی زوال کے ساتھ سلطانی دور اور مغلیہ دورِ حکومت کا تمدن زوال پر تھا۔ مرہٹوں، جاٹوں، افغانیوں اور دوسرے حملہ آوروں کے ہاتھوں نہ صرف دلی شہر بلکہ شہر کے باہر کی عمارتوں کو بھی شدید بربادی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شاہ عالم ثانی کے دورِ آخر میں دلی کی اس بربادی کا جائزہ لیتے ہوئے فرینکلن نے یہ لکھا تھا:

> شالیمار کے قریب جنوب میں دہلی کی جانب کا علاقہ حدِ نظر تک وسیع باغات، شہ نشینوں، مسجدوں اور قبرستانوں سے پٹا پڑا ہے۔ کسی زمانے کے اس عظیم الشان اور مشہور ومعروف شہر کا سواد کھنڈرات کے بے ہنگم ڈھیر سے کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا اور گردونواح کے مضافات بھی مساوی طور پر اجاڑ، سنسان اور ویران ہیں۔ (۱)

فرینکلن نے شاہ عالم کے دور میں شاہجہاں کی بنائی ہوئی سنگ سرخ کی نہر کا بھی ذکر کیا ہے جو عہد زوال میں تباہ ہو چکی تھی۔ مگر اس خوب صورت نہر کے آثار اس وقت تک باقی تھے اور نہر کوڑے کرکٹ سے اٹی ہوئی تھی۔ (۲)

مغلیہ دور کے مٹتے ہوئے تمدن کو دیکھ کر سرسید کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ آثار تیزی سے فنا ہو رہے ہیں اور مستقبل میں ان کے نشان بھی بمشکل نظر آسکیں گے لہٰذا یہ وقت ہے کہ کم از کم ان آثار کو کاغذ ہی پر منتقل کر دیا جائے۔ سرسید نے اس خیال کو عملی شکل دینے کے لیے دن رات محنت کی۔ تاریخی کتب، دستاویزات، تاریخی روایات کا مطالعہ کیا اور ان آثار کا بذات خود جائزہ لینے کے لیے ان تمام مقامات کو بھی دیکھا۔ یہ بے حد دشوار تھا بلکہ fieldwork کا کام بہت مشکل تھا۔ تحقیق کا ایک مرحلہ پرانی عمارتوں کے بارے میں کوائف فراہم کرنا تھا اور دوسرا مرحلہ ان عمارتوں کے کتبات کو پڑھنے کا تھا۔ اس تھکا دینے والے کام میں ان کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑا اور کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا تذکرہ حالی نے حیات جاوید میں کیا ہے:

> سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عماراتِ بیرونِ شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے۔ اور جب کئی دن کی تعطیل ہوئی ہوتی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر اُن کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے ...
>
> ... باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہوسکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہوگئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے ان سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اُس سے کیا مقصود تھا، کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے اُن کا مستقل حال دریافت

کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہوگئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض وطول وارتفاع کی پیمائش کرنی، ہرایک عمارت کی صورتِ حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے اور ہرایک کتبے کو بعینہٖ اُس کے اصلی خط میں دکھانا، ہرٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچوانا اوراس طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ براہ ہونا فی الحقیقۃ نہایت دشوار کام تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ ''قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے اُن کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہرایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اورخوف کے مارے اُن کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا'' ... (۳)

اُردو کا شائد ہی کوئی محقق اِن مصائب سے گزرا ہو کہ جن مصائب کو سرسید احمد خان نے برداشت کیا تھا۔ آثار الصنادید کے مضامین کی فہرست کو ہم مختصراً یہاں درج کرتے ہیں:

فرماں رواؤں کے حالات، دلی کے پرانے قلعوں اور مختلف اوقات میں دلی کے شہروں کا بیان، لال قلعہ کی عمارتوں پر خصوصی نوٹ، شہر شاہجہاں آباد، دروازوں کے نام، کھڑکیوں کے نام جیسے زینت المساجد کی کھڑکی، مختلف لاٹھیں، مقابر، باغات، مساجد، اُردو زبان کے بیان میں، شخصیات، علما، خطاط، مصور، موسیقار، شعرا، قلعہ جات، تاریخی عمارات، کتبے، نقشے۔

یہ سب مثالیں اردو میں عملی طور پر تاریخی تحقیق کے ابتدائی نقوش پیش کرتی ہیں۔

سرسید نے آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں اپنی تحقیق کے ماخذات کا حوالہ نہ دیا

تھا کہ اس دور میں مغربی انداز کے مطابق حوالہ جات درج نہیں کیے جاتے تھے۔ مگر جب کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں تیار ہوا تو اس میں انہوں نے اپنے تحقیقی کام کے ماخذات کے حوالے پیش کیے تھے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حوالہ نگاری کا اسلوب ان کو اے۔اے۔رابرٹس (A. A.Roberts) نے سکھایا ہوگا جو سرسید کے مہربان دوست تھے اور یہی آثار الصنادید طبع اول کا ایک نسخہ لندن لے گئے تھے جہاں اسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا گیا تھا اور اس کام کی بہت تحسین ہوئی تھی۔ لندن ہی میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ آثار الصنادید کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جائے اور یہ کام مسٹر رابرٹس کے سپرد ہوا تھا۔ دلی واپسی کے بعد انہوں نے سرسید کی مدد سے ترجمہ شروع کیا تو اس دوران میں یہ خیال آیا کہ اس کتاب کو از سرِ نو مرتب کر کے خامیاں دور کی جائیں اور ایک نیا ایڈیشن تیار کیا جائے۔ ہمارا قیاس ہے کہ اے۔اے۔رابرٹس کے مشورے سے سرسید کو ماخذات کے حوالے درج کرنے کا خیال آیا ہو گا۔ اُردو تحقیق کی روایت کے حوالے سے یہ ایک بڑی پیش رفت تھی۔ مگر انیسویں صدی میں اس روایت کا تسلسل قائم نہ ہوسکا۔ سرسید نے طبع ثانی کے پیش لفظ میں اپنے ماخذات کی ایک فہرست پیش کی، اس فہرست کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرسید نے آثار الصنادید کی تالیف کے دوران میں کس حد تک تحقیقی ماخذات سے استفادہ کیا ہوگا۔ اردو تحقیق کی دنیا میں آثار الصنادید کو اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ سرسید نے جن کتابوں سے استفادہ کیا تھا اس کی فہرست ہم یہاں درج کرتے ہیں:

توریتِ مقدس، راجاولی، خلاصتہ التواریخ، سلسلہ الملوک، مہا بھارت، بھاگوت، آئین اکبری، جغرافیہ، تاج المآثر، تاریخ فرشتہ، توزکِ جہانگیری، اکبر نامہ، پوتھی اندر پرست مہاتم، مراتِ آفتاب نما، نزھتہ القلوب، جواھرالحروف، لب التورایخ، نہ سپہر، تاریخ ھدایت اللہ خان، تاریخ فیروز شاھی، ضیا برنی، توزکِ

تیموری ، ابطال ضرورت، خزائن الفتوح یعنی تاریخ علائی ، تاریخ شیخ عبدالحق ، فتوحات فیروز شاہی ، اخبار الاخیار، تاریخ فیروز شاہی ، شمس سراج عفیف۔ ظفر نامہ ء تیموری ، شاہ جہان نامہ ، کتاب آرکیولیجکل سوسیٹی بنگال نمبر۳، ۴، ۶، ۷، کتاب رویل اسیاٹک سوسیٹی نمبر ۶، ہفت اقلیم ، تاریخ کشمیر، پوتھی ہائی بہات ، تقویم البلدان ، قصیدئہ ہمزیہ ، مآثر الامرا، مآثر عالمگیری ، زیج محمد شاہی ، مارکندی پوران ، ابوالفدا۔ (۴)

آثارالصنادید سرسید کی تصنیف تھی جسے انہوں نے نہایت محنت وکاوش سے مکمل کر کے اردو تحقیق کی دنیا میں ایک اعلیٰ مثال قائم کی تھی۔ اُردو تحقیق میں ان کی دو اور کتابیں بھی ہیں جن کا تعلق تاریخی تحقیق سے ہے۔ یہ کتابیں ان کی تصنیف نہیں ہیں۔ سرسید نے ان کتب کی تدوین کا کام کیا تھا۔ یہ آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی ہیں۔ اس دور تک اس نوعیت کے کسی دوسرے کام کی مثال نہیں ملتی ہے۔

تاریخی تحقیق میں سرسید کی مرتب کردہ آئین اکبری کو ایک مستند کام سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب کی تدوین کا کام بے حد دشوار تھا۔ حالی نے تدوین کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے ان باتوں کی وضاحت کی ہے کہ تدوین کے دوران میں سرسید کو کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ قلمی نسخوں کا تھا کہ جن کی بنیاد پر وہ آئین اکبری کی تدوین کا کام کرنا چاہتے تھے۔ دستیاب شدہ نسخوں میں بہت سے خلا پائے گئے تھے، بہت سی مبہم باتیں تھیں، بہت سی وضاحتوں کی ضرورت تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ عہد اکبری کی بے شمار چیزوں کو عہد سرسید میں سمجھنا دشوار ہو گیا تھا۔ یہ سب دقت طلب مراحل تھے۔ سرسید نے کمال جستجو اور تحقیق سے ان کو طے کیا اور یوں اپنے نسخے کو جدید تقاضوں کے مطابق تیار کیا:

آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی دوسرے جس قسم کے مضامین اُس میں بیان کیے گئے ہیں، فارسی لٹریچر میں کبھی اُس قسم کے مضامین نہیں ہوئے تھے اس لیے اُس کے پڑھنے سے جی الجھتا تھا پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو وخطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے۔ اِس لیے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اُس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے۔ اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانے میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھی اُن کی جابجا تشریح کی اُس زمانے کے اوزان اور نقود کی اس زمانہ کے اوزان ونقود سے مطابقت کی جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے۔ ان کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ (۵)

بعض مسائل میں سرسید کو بالخصوص مشکل پیش آئی۔ مثلاً یہ کہ متن کی جدولوں میں بعض مقامات پر ابوالفضل سے غلطی ہو گئی تھی جسے کمال کوشش سے درست کیا گیا۔ جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا سرسید نے متن کے مواد کو واضح کرنے کے لیے تحقیقی مسائل حل کیے۔ جیسے متن کی جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حرف درج کیے گئے تھے، سرسید نے ان کی قیمت ہندسوں میں لکھ دی۔ ایک مرحلہ یہ بھی پیش آیا کہ کچھ جدولیں ایسی بھی تھیں جو ملنے والے نسخوں میں مختلف پائی گئیں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے انگریزی داں حضرات کی مدد سے آئین اکبری کے ترجمہ سے رجوع کیا جہاں یہ جدولیں صحت کے ساتھ درج تھیں۔ آئین اکبری میں جہاں سکّوں کا بیان ملتا ہے وہاں حواشی میں ان سکّوں کی دو دو تصویریں دے کر دونوں طرف کی عبارتوں کو بھی لکھا۔ (۶)

سرسید کے دور تک تدوین کے جدید طریقے رائج نہ تھے۔ متن کو ہر اعتبار سے درست

اور با معنی بنا کر شائع کرنے کا رواج نہ تھا۔ کاتب حضرات کو کوئی نسخہ دے دیا جاتا تھا اور وہ اس کو دیکھ کر مکھی پہ مکھی مارتا چلا جاتا تھا اور ستم یہ کہ نسخہ پہلے سے زیادہ غلط تیار ہوتا تھا۔ یہ دستور نہ تھا کہ کوئی پڑھا لکھا شخص کچھ نسخے سامنے رکھ کر ایک صحیح نسخہ تیار کرے۔ ہمارے ہاں اس قسم کی مثالیں مشکل ہی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس لحاظ سے سرسید کا کام قابل تعریف اور قابل تقلید تھا۔

آئینِ اکبری کی تدوین کا کام سرسری طوری پر نہ کیا گیا تھا۔ یہ کام صرف متن کی تصحیح تک ہی محدود نہ تھا۔ بہت سا کام متن کی داخلی ضروریات اور اسے مزید بہتر بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرسید کے ہاں تدوین متن کا تصور کتنا پھیلا ہوا تھا۔ ہمارا قیاس ہے کہ اس نوعیت کی تدوین کا طریقہ انہوں نے ہندوستان میں موجود کمپنی یا حکومتِ برطانیہ کے ان افسروں سے سیکھا ہوگا جو تاریخ میں دل چسپی رکھتے تھے اور سرسید سے ان کے تعلقات علمی سطح پر تھے۔ سرسید نے آئینِ اکبری کی تدوین کو اس حد تک پھیلا دیا تھا کہ متن سے متعلق اشیا اور مقامات کی بے شمار تصویریں انہوں نے متن کو دل چسپ بنانے کے لیے بذاتِ خود تیار کروائیں۔ حالی وضاحت کرتے ہیں کہ آئینِ اکبری کے متن میں خال خال تصویریں تو تھیں مگر سرسید نے ان کے علاوہ بہت ساری تصاویر اپنی خصوصی توجہ سے تیار کروا کے اپنے مرتب کردہ متن کو بہت مفید بنا دیا تھا۔ ہم اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس دور میں ایسے معیاری متن کا حصول صرف یورپ میں تھا، ہندوستان میں کوئی روایت نہ تھی:

> پھر اصل آئین میں خال خال تصویریں تھیں۔ سرسید نے نہایت محنت و جانفشانی اور حسن اہتمام سے بے شمار تصویریں دلی کے لائق مصوروں سے کھچوا کر کتاب میں اپنے اپنے موقع پر داخل کیں۔ مثلاً ٹکسال کے متعلق تقریباً پچاس پچپن تصویروں کے دو بڑے بڑے مرقعے کھچوائے جن میں مختلف کاریگر اپنے آلات اور ظروف اور اوزار لیے ہوئے جدا جدا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح فلزات کے متعلق ترازوے ہوائی و ترازوے آبی کی تصویر، شکار اور یورش کے موقع پر خیمہ گاہ بادشاہی کی تصویر، آئین

> چراغ خانہ کے متعلق اکبر کی آتش پرستی اور اُس کے تمام لوازمات کی تصویر، آئین شکوہ سلطنت کے متعلق تمام سامان توزک واحتشام کی تصویریں، فیلخانہ اور ہاتھیوں کی پوشش اور ہاتھیوں کی کشتی کی تصویریں، علی ہذالقیاس تمام پھلدار درختوں کی اور ہر ایک درخت کے ساتھ اُس کی شاخ اور برگ وثمر یا پھول اور پتے کی تصویریں، اوراق گنجفہ قدیم اور گنجفہ مخترعہ اکبر کی تصویریں اور تمام زیوروں کی تصویریں اور اُن کے سوا اور بہت سی تصویریں کھچوا کر کتاب میں شامل کیں۔ (۷)

کاش کہ سرسید نے آئینِ اکبری کی تدوین کا سارا کام اگر اردو میں کیا ہوتا تو تدوین متن کی تحقیق کا پہلا بڑا کام ہوتا۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ انیسویں صدی میں تدوین کا کام کرنے والوں نے اسے مثال نہ بنایا۔ بیسویں صدی کے محققین نے بھی آئینِ اکبری کی روایت کو اختیار نہ کیا۔ انجمن ترقی اردو نے اردو تحقیق اور تدوین کو آگے بڑھایا۔ بیشمار متون مرتب کر کے شائع کیے مگر سرسید جیسا ٹھوس کام انجمن بھی نہ کروا سکی۔

اس نوعیت کا کام بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں رشید حسن خان نے کیا۔ گلزارِ نسیم، سحرالبیان، فسانہ عجائب اور باغ و بہار کی تدوین اعلیٰ معیارات پر کی گئی۔ متن اور متعلقات متن پر مثالی محنت اور کاوش کی گئی۔ سرسید ڈیڑھ صدی قبل تدوین کے جن معیارات تک تحقیق کو لے گئے تھے۔ رشید حسن خان نے تدوین کے اُن معیارات کو مزید آگے بڑھایا۔

آئینِ اکبری کے سلسلے ہی میں ایک دل چسپ واقعہ بھی پیش آیا تھا، ہوا یوں کہ جب اس کا متن تیار ہو گیا تو سرسید نے اس عہد کے بڑے شاعر مرزا غالب سے یہ درخواست کی کہ وہ اس نسخہ کے لے ایک تقریظ لکھ دیں۔ غالب کے سامنے جب کتاب پیش ہوئی اور انہوں نے اس کے مندرجات دیکھے تو مایوس ہوئے ان کا کہنا یہ تھا کہ اس کتاب کے لکھنے سے بہتر تھا کہ سرسید انگریزوں کی جدید technology کا مطالعہ کرتے اور اس سے کچھ بہتر یہ کہ وہ انگریزوں کی تار برقی اور دخانی جہازوں کی ترقی کا ذکر کرتے۔ آئینِ اکبری پر کام کرنے سے تو جدید تکنیک کا مطالعہ

زیادہ بہتر تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ غالب نے ان خیالات کا اظہار کیوں کیا؟ اس کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۸۲۸ء میں غالب نے کلکتہ کا سفر کیا تھا۔ کلکتہ کی جدید مغربی تہذیب کے مظاہر کو دیکھ کر غالب حیران رہ گئے تھے۔ ان کے دوران قیام ہی میں انگلستان سے دخانی جہاز کلکتہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے تھے۔ اس حیرت انگیز کام کو دیکھ کر وہ یوں حیران رہ گئے تھے۔ کلکتہ قیام کے قیام میں ہی انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ انگریز مغلوں کے پرانے زوال یافتہ نظام کے مقابلے میں ایک ترقی یافتہ تہذیبی نظام کو پیش کر رہے تھے۔ اس اعتبار سے وہ ان پہلے ہندوستانیوں میں تھے جو مغربی تہذیب اور technology کی ترقی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور ہندوستان کی ترقی کے لیے وہ اسی قسم کا نظام چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آئین اکبری کی جگہ نئے آئین کو ترجیح دیتے تھے۔ جب سرسید کو غالب کی تقریظ ملی تو وہ بے حد مایوس ہوئے تھے انھیں غالب کی باتیں اس وقت تو ناگوار محسوس ہوئی تھیں۔ مگر سن ستاون کے بعد وہ تیزی کے ساتھ مغربی تہذیب کے شیدا بن گئے اور دن رات ان خیالات کی نشر و اشاعت کرنے لگے تھے۔ غالب نے مثنوی کی شکل میں جو تقریظ لکھی تھی ہم اس کے کچھ حصے قارئین کی دل چسپی کے لیے درج کرتے ہیں ــــ

گر ز آئین میرود با من سخن
چشم بکشا و اندریں دیر کہن

[اگر ہم سے آئین (نظام سلطنت) کے متعلق گفتگو ہو تو ہم (ہم کہیں گے کہ دنیا کے) اس پرانے بُت خانہ میں۔]

صاحبان انگلستان را نگر
شیوہ و انداز ایناں را نگر

[نئے آئین پر آنکھیں کھولو، انگریزوں کو دیکھو، اُن کے طریق کار پر نگاہ ڈالو۔]

تا چہ آئین ہا پدید آوردہ اند
آنچہ ہرگز کس ندید، آوردہ اند

[کیسے کیسے قوانین انھوں نے بنا کر دیے ہیں۔ جو کبھی دیکھا نہ تھا، انھوں نے وہ کر کے دکھا دیا ہے۔]

زین ہنرمندان ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشیاں پیشی گرفت

[(انگلستان والے) ان ہنرمندوں کی بدولت خود ہنر میں اضافہ ہو گیا، ان کی کوششیں اگلوں سے بھی آگے نکل گئیں۔]

حق ایں قوم ست ''آئین'' داشتن
کس نیارد ملک بہ زین داشتن

[(سلطنت کا) نظام چلانا اسی قوم کا حق ہے، کوئی بھی ان سے بہتر ملک داری نہیں کر سکتا۔]

داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئین بستہ اند

[انھوں نے عقل اور انصاف کو یکجا کر دیا ہے، اور ہندوستان کو سو طرح کے قاعدے قانون دے دیے ہیں۔]

آتشی کز سنگ بیرون آورند
این ہنرمندان زخس چون آورند

[آگ یوں تو پتھر (کی رگڑ) سے نکل آتی ہے لیکن ان ہنرمندوں نے تنکے (تار) سے آگ کیسے نکال دی۔]

تا چہ افسون خواندہ اند ایناں بر آب
دُود کشتی را ہمی راند در آب

[پانی پر انھوں نے کیا جادو کیا کہ دُھواں (سٹیم) کشتی کو اڑائے لیے جاتا ہے۔]

گہہ دخان کشتی بہ جیہوں می برد
گہہ دخان، گردون بہ ہاموں می برد

[کبھی دُھواں کشتی کو دریا میں لے جاتا ہے، اور کبھی انجن کو دشت و صحرا میں۔]

غلتک گردون بگرداند دخان
نرہ گاو و اسپ را ماند دخان

[دُھواں انجن کے سلنڈر کو گھماتا ہے اور یوں دوڑتا ہے جیسے تیز رفتار بیل یا گھوڑا۔]

از دخان زورق برفتار آمدہ

باد و موج، این ہر دو بیکار آمدہ

[دھوئیں سے اسٹیمر حرکت میں آ جاتے ہیں ہوا (کے جھونکے) اور موج (کے تھپیڑے) کی اہمیت نہیں رہتی۔]

نغمہ ہابی زخمہ از ساز آورند

حرف چون طائر پرواز آورند

[مضراب لگائے بغیر باجے سے نغمے پیدا کرتے ہیں اور لفظ یا کلام کو پرندے کی طرح اڑا دیتے ہیں۔ (تار برقی کی طرف اشارہ)]

ہین، نمی بینی کہ این دانا گروہ

در دو دم آرند حرف از صد کروہ

[کیا دیکھتے نہیں ہو کہ عقلمند گروہ دو منٹ میں سینکڑوں کوس کی بات پہنچا دیتا ہے؟]

میزنند آتش بباد اندر ہمی

میدرخشد باد چون اخگر ہمی

[یہ لوگ ہوا میں آگ لگا دیتے ہیں اور ہوا انگارے کی طرح دہکنے لگتی ہے۔ (گیس کے ہنڈے جلتے ہیں)]

رو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ

شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

[لندن جاؤ (دیکھو) کہ اس چمکتے ہوئے باغ میں رات کے وقت چراغ کے بغیر شہر روشن ہو جاتا ہے۔]

کار و بار مردم ہشیار بین

در ہر آئین صد نو آئین کار بین

[ان ہوشیار آدمیوں کے کام دیکھو، ایک ایک نظام میں سو طرح کی کاری گری اور انتظام کا تماشا کرو۔]

پیش این آئین کہ دارد روزگار

گشتہ آئین دگر تقویم پار

[آج زمانے میں جو آئین چل رہا ہے اس کے سامنے دوسرے آئین پرانی جنتری (کی طرح بیکار) ہو کر رہ گئے ہیں۔] (۸)

اِس تقریظ کے سبب سر سید کے دل میں رنجش پیدا ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے تقریظ کو کتاب میں شامل نہ کیا تھا۔ یہ رنجش مدتوں قائم رہی دونوں بزرگوں کے درمیان یہ کشیدگی کس طرح سے ختم ہوئی سر سید نے اس کا حال یوں قلم بند کیا ہے:

سر سید کہتے تھے کہ ''جب میں مراد آباد میں تھا اُس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے اُن کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر جب دلّی کو واپس جاتے تھے میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں آ کر ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آیا۔'' ظاہراً جب سے کہ سر سید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا اُن سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا اور اسی لیے مرزا نے مراد آباد میں آنے کی اُن کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سر سید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اُترے تو ایک بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اُس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی سر سید نے کسی وقت اُس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے سر سید نے کہا آپ جمع خاطر رکھیے میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے مرزا صاحب نے کہا ''بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے۔ اُنھوں نے کوٹھری میں لیجا کر بوتل دکھا دی آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی لیے تم نے کوٹھری میں لا کر رکھی تھی حافظ نے سچ کہا ہے۔

واعظاں کایں جلوہ در محراب و منبر میکنند　　چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند''

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی رفع ہوگئی مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دتی چلے آئے۔(۹)

آئین اکبری کی صرف پہلی اور تیسری جلد شائع ہو سکی تھی۔ دوسری جلد سن ستاون میں طباعت کے دوران تلف ہوگئی تھی۔ اس جلد کو سرسید نے اپنے نانا کے کتب خانہ کی مدد سے تیار کیا تھا اور اس کے ساتھ ایک مفصل دیباچہ بھی سپرد قلم کیا۔ بدقسمتی سے یہ سارا قیمتی مواد اس ہنگامے کی نذر ہو گیا تھا۔(۱۰)

۱۸۵۷ء سے قبل سرسید کی علمی توجہات کا مرکز ہندوستان کی تاریخ تھی۔ آثار الصنادید اس قسم کی پہلی مثال تھی دوسری مثال آئین اکبری کی تھی اور تیسری مثال تاریخ فیروز شاہی کی تدوین ہے۔ یہ کام ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے۔ اس کے بعد کے ادوار میں سرسید کی توجہ مذہب، تعلیم، سیاست، صحافت اور معاشرے کی طرف ہوگئی تھی اور اصلاحات کے کاموں میں از بس مصروف رہنے کے باعث وہ تاریخی تحقیق کے کام سے تقریباً دست بردار ہو گئے تھے۔

ضیاء الدین برنی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی بہت اہم کتاب تھی مگر سرسید کے زمانے میں کم یاب ہوگئی تھی۔ اس کی اشاعت کا قصہ یہ ہے کہ ۱۸۶۱ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے سرسید سے رابطہ کر کے یہ درخواست کی کہ وہ اگر تاریخ فیروز شاہی کے متن کی تصحیح کر کے ایک مستند نسخہ تیار کر دیں تو سوسائٹی اس کام کو شکریہ کے ساتھ شائع کرے گی۔

سرسید نے سوسائٹی کو بتا دیا کہ وہ یہ کام کریں گے۔ اس کام کے انجام دینے میں سب سے بڑی رکاوٹ مستند نسخوں کا حصول تھا۔ بہت تلاش اور جستجو کے بعد سرسید کو ایک نسخہ حاصل ہوا مگر اس میں بہت اغلاط پائی گئیں۔ اس لیے اس کی تصحیح میں بہت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد نسخوں کی تلاش کا کام جاری رہا۔ اس تلاش کے نتیجہ میں ان کو ایک نسخہ لال قلعہ سے حاصل ہوا مگر یہ ناقص نکلا۔ اس کے بعد ایک نسخہ مشہور مورخ ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ (H.M.Eliot) نے فراہم کیا۔

ایک اور نسخہ برطانوی آفیسر Edward Thomas نے بہم پہنچایا۔ اسی تلاش کے نتیجہ میں بنارس سے بھی ایک نسخہ مل گیا۔ سرسید نے سب سے پہلے ملنے والے نسخے کو بنیاد بنا کر اس کا مقابلہ دیگر چار نسخوں سے کیا۔ متن کو درست کرنے کی بھرپور کوشش کی، اس طرح جو نسخہ تیار ہوا اسے ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے شائع کر دیا گیا۔(۱۱)

سرسید کے تحقیقی کام میں دستاویزی تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ بھی موجود ہے اس نمونہ کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مخطوطہ شناسی کے فن سے واقف تھے اور ایک ماہر مخطوطہ شناس کی طرح کسی بھی مخطوطہ سے متعلق حقائق اور اس مخطوطہ کی اصل یا نقل کے معاملات کا تعین کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی مہارت اور مخطوطہ شناسی کی صلاحیت اخبار سائنٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ میں ۲۵ مارچ ۱۸۷۰ء کے شمارے میں شائع شدہ ایک مضمون میں دیکھی جا سکتی ہے جس کا موضوع انڈیا آفس لائبریری میں موجود قرآن شریف کا ایک نسخہ تھا اور اس نسخے کے بارے میں یہ دعویٰ موجود تھا کہ یہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس دعویٰ کے باعث شائقین نسخہ ہذا کو بہت عقیدت اور ذوق وشوق سے دیکھتے تھے۔ سرسید ۱۸۶۹ء میں لندن گئے تھے تو اس وقت اس مخطوطہ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے اس مخطوطہ کے جو کوائف بیان کیے تھے وہ یہ تھے:

ا　یہ پورا قرآن نہیں تھا، نسخہ صرف بیس اوراق پر مشتمل تھا۔

ب　نسخہ کا خط کوفی تھا اور نہایت خوش خط تھا۔

ج　اوراق پر سنہری کام بھی کیا گیا تھا۔

د　یہ نسخہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھ کے اسباب نیلام میں خریدا تھا اور وہاں سے اس خیال کے باعث لندن بھیج دیا گیا تھا کہ یہ حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس لیے بہت نادر نسخہ قرار دیا گیا تھا۔(۱۲)

سرسید احمد نے نسخہ کی روایت کو بھی بیان کیا تھا۔ روایت کے بموجب حضرت علیؓ کی

وفات کے بعد یہ نسخہ مکہ میں رہا اور وہاں سے ان سلاطین اسلام کے قبضے میں چلا گیا جن کی مہریں اس پر ثبت ہیں۔

سرسید احمد نے اس روایت پر بالکل یقین نہ کیا اور ایک ہی سانس میں اسے لغو، بے اصل اور مہمل کہہ دیا اور اس بات کا اضافہ بھی کیا کہ اس پر ذرا بھی یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سرسید نے اس روایت کو کن اسباب کی بنا پر بے اصل کہا تھا اور کیا وجوہات تھیں کہ وہ روایت پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اس سلسلے میں سرسید نے کسی قسم کی وضاحت نہیں کی ہے۔ بس اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ تحقیق میں ایسے مسائل پر دلائل کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ یہاں دلائل نہیں دیے گئے ہیں۔ دستاویزی تحقیق میں کسی دستاویز کی صداقت ثابت کرنے کے لیے دلائل ضروری ہوتے ہیں۔ جب تک دلائل پختہ نہ ہوں دستاویز کی صداقت کو تسلیم نہ کیا جائے گا۔ اس زمانے میں اس دستاویز کو حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ثابت کرنے کے لیے جو دلیلیں دی گئیں وہ یہ تھیں:

اول: یہ کہ اس پر امیر تیموری کی مُہر ہے جس کی فتوحات ۸۰۰ھ تک نہایت وسیع ہو گئی تھیں۔

دوم: یہ کہ اس پر مُہر و دستخط شاہ اسماعیل صفوی بقید ۹۱۵ھ کے ثبت ہیں۔

سوم: یہ کہ اس پر مُہر و دستخط شاہ اسماعیل ثانی اور یہ عبارت کہ اس نے یہ قرآن مجید داروغۂ کتب خانۂ ملک کو سپرد کیا، بقید ۱۵ جلوسی کے ثبت ہیں۔

چہارم: دستخط شاہ عباس بھی اس پر ثبت ہیں۔

پنجم: شاہ جہاں بادشاہ کے دستخط بقید ۱۰۴۵ھ اور تصدیق افضل خاں اور عنایت خاں، اس کے وزیروں کی، کہ یہ قرآن پندرہ سو اشرفیوں کو خریدا گیا، ثبت ہے۔

ششم: اس پر مُہر و دستخط اعتماد خاں وزیر عالم گیر کے بھی ثبت ہیں۔

ہفتم: جو صلح نامہ کہ ۱۲۵۴ھ میں درمیان میر محمد خاں و میر نور محمد خاں و میر نصیر خاں ہوا تھا وہ بھی اس کے ایک ورق پر ثبت ہے۔ (یہ ایک رسم مسلمانان ہندوستان کی تھی کہ قرآن پر عہد نامے لکھے جانے کو زیادہ موکد سمجھتے تھے)

پس ان تمام دلیلوں سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ہرگاہ یہ قرآن ایسے اہتمام سے رہا اور ایسا مقدس سمجھا گیا ہے تو بجز حضرت علی مرتضیٰؓ کے ہاتھ کے اور کس کے ہاتھ کا ہو سکتا ہے!(۱۳)

مندرجہ بالا دلیلوں کی بنیاد پر اس دور میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ قرآن کے یہ اوراق بہت اہتمام سے رہے ہیں اور نسخہ کو بہت مقدس سمجھا گیا ہے لہٰذا حضرت علیؓ مرتضیٰ کے علاوہ یہ کس کے ہاتھ کا ہو سکتا ہے؟

سرسید احمد کے لیے اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ بذات خود کن دلائل کی روشنی میں مندرجہ بالا دلیلوں کو ردّ کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید احمد مخطوطہ شناسی کے فن سے گہری واقفیت رکھتے تھے ایک ماہر مخطوطہ شناس کی طرح وہ قدیم مخطوطوں کے کاغذ، روشنائی، طرزِ کتابت اور املا کے نمونوں کو دیکھ کر ان کے عہدِ تحریر کی قدامت کا تعین کر سکتے تھے چناں چہ اسی فنی مہارت کی بدولت جب انہوں نے قرآن کے مذکورہ بالا نسخے کو دیکھا تو آسانی کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ یہ مخطوطہ حضرت علیؓ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ سرسید کے دلائل یہ تھے کہ کوفی رسم الخط کی قدیم تحریریں دیکھنے کا ان کو موقع مل سکا ہے۔ ہندوستان میں انہوں نے اس خط سے ملتے جلتے مخطوطے بھی دیکھے تھے۔ قرآن کا یہ نسخہ اسی رسم الخط اور خوش نویسی کے انداز میں لکھا گیا ہے اور اس میں وہی مرکب روشنائی استعمال کی گئی ہے جو روشنائی ان کی نظر سے گزرے ہوئے مخطوطات میں استعمال کی گئی تھی۔ چوں کہ ان کے دیکھے ہوئے مخطوطات کا زمانہ آٹھ سو برس سے پہلے کا نہیں تھا اس لیے یہ نسخہ قرآن کسی طرح سے بھی آٹھ سو برس پہلے کا قرار نہیں دیا جا سکتا۔(۱۴) اپنے اس دعویٰ کی تقویت کے لیے انہوں نے ایک داخلی شہادت بھی فراہم کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس نسخہ پر ثبت مہریں اور تصدیقیں تو دیکھی جا سکتی ہیں مگر کسی جگہ اس بات کا اشارہ نہیں ملتا ہے کہ یہ مخطوطہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مخطوطے کی مہروں کے متعلق سرسید نے یہ لکھا تھا کہ بظاہر یہ اصلی معلوم ہوتی ہیں مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرانے زمانوں سے مفاد پرست مہروں میں جعل سازی بھی کرتے رہے ہیں اس لیے ان مہروں کی صداقت پر مزید غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔(۱۵)

سرسید کے دور میں اور اس کے بعد بھی تحقیق اور تدوین کے مغربی اصول مدت تک رائج نہ ہو سکے تھے۔ البتہ آئین اکبری کی تدوین کے دوران میں ان کے یورپی سکالرز اور احباب نے تدوین کے جدید اصولوں سے ان کو یقیناً روشناس کرایا ہوگا کیونکہ آئین اکبری کی تدوین کا خاکہ بذات خود اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ یہ مغربی اثرات سے تیار کیا گیا ہے۔ جہاں تک اصول تحقیق کا تعلق ہے، سرسید کے ہاں دستاویزی تحقیق/تاریخی تحقیق کے اصولوں کا استعمال نظر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں ان کا انحصار اسلام کے اصول حدیث پر رہا ہے۔ وہ حدیث کے اصولوں سے رجوع کر کے اپنے لیے تحقیقی اصول تلاش کرتے ہیں۔ سرسید کے ہاں روایت اور درایت کا استعمال بھی موجود ہے۔ اردو میں انہوں نے یہ تصور شائد شبلی سے پہلے پیش کیا تھا۔ اسی طرح سے حدیث کے اصولوں کو بھی وہ شبلی سے پہلے پیش کر چکے تھے۔ انہوں نے علم حدیث کے جو اصول وضع کیے تھے وہ ادب کی تحقیق میں بھی استعمال ہو سکتے تھے۔ مثلاً انہوں نے اس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ کسی روایت میں وقت کے ساتھ ساتھ الحاقی باتیں کس طرح سے شامل ہوتی جاتی ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اسی قدر زائد باتیں کہ جو روایت یا کسی اصل واقعہ کا حصہ نہیں ہوتی ہیں شامل ہوتی جاتی ہیں۔ تاریخی واقعات جو بادشاہوں، سلطنتوں اور ملکوں کے حالات میں لکھے جاتے ہیں، ان میں ایسی زائد اور بے اصل باتوں کا اضافہ مقابلتاً ہوتا ہے مگر واقعات مذہبی اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ان کا تذکرہ زمانہ دراز تک قائم رہتا ہے اس لیے زائد اور بے اصل باتیں ان واقعات میں شامل ہوتی جاتی ہیں۔

اب مسئلہ یہ بنا کہ روایت جس طرح اپنے اصل سے دور ہوتی جاتی ہے، اس میں الحاقی عنصر شامل ہوتا جاتا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ تحقیق کیا ہے؟ تحقیق اصل میں ان زائد عناصر کی نشاندہی کا نام ہے۔ اس مقام پر سرسید ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ ایک محقق جو یہ چاہتا ہے کہ روایتوں میں سے صحیح کو غیر صحیح سے کیسے تمیز کرے تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ کسی روایت کو اس کے ہم عصر ماخذوں میں تلاش کر کے اس کی صحیح شکل کو دریافت کیا جائے۔ (۱۶) تحقیقی اصولوں کے سلسلے میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی بھی غیر مستند حوالے کو کسی بھی صورت قبول نہ کیا جائے مثال کے

طور پر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس تزک بابری، تزک تیموری اور تزک جہانگیری جیسی کتب موجود ہیں جو خود ان بادشاہوں کی لکھی ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ معاصر مورخین کی لکھی ہوئی تاریخیں بھی ہیں۔ اب اگر ہم کو کوئی ایسی روایت ملے جو ان کتب میں بیان کردہ روایت کے برعکس ہو تو ہم بلاشبہ اس روایت کو قبول نہیں کریں گے کیوں کہ یہ روایت غیر مستند ہے (۱۷)۔ تحقیق کے کام میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کوئی کتاب خواہ وہ کتنی بھی مستند و معتبر کیوں نہ ہو اگر اس میں کوئی غیر معتبر روایت بیان کی گئی ہو تو اس کو قبول نہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے تفسیر ابن جریر، تفسیر کبیر، سیرت ابن ہشام اور سیرت ابن اسحاق کی مثالیں پیش کی ہیں۔ سرسید نے ۱۳۱۲ھ میں احادیث پر ایک عالمانہ مقالہ سپرد قلم کیا تھا اس مقالہ کے آخر میں اُنہوں نے کسی حدیث کی صداقت کو جانچنے کے لیے جو معیار مقرر کیا تھا وہ درایت کا تھا۔ انہوں نے یہ لکھا تھا کہ ہمارے نزدیک حدیثوں کی صحت کا دارومدار بہ نسبت راویوں کے زیادہ تر درایت پر منحصر ہے۔ (۱۸)

سرسید کے ہاں علمی تحقیق، اصول تحقیق اور تدوین متن کے اصولوں کے معیارات واضح شکل میں موجود تھے۔ تحقیق کے میدان میں ان کا شمار ان علما میں کیا جانا چاہیے جنہوں نے انیسویں صدی کے نصف اول سے کچھ قبل اور اس کے بعد تحقیق میں نہایت قابل قدر کام کیے۔ انہوں نے عملی تحقیق اور تدوین میں ایسے کارنامے انجام دیے جو واقعتاً بے مثال تھے اور انہوں نے اپنے دور میں تحقیق کو نہایت اعلیٰ معیارات تک پہنچا دیا تھا۔

حوالہ جات

* ڈاکٹر تبسم کاشمیری، وزیٹنگ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور۔

(۱) ولیم فرینکلن، تاریخ شاہ عالم، ترجمہ ثناء الحق صدیقی (کراچی: آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس، ۱۹۷۶ء)، ۲۸۵-۲۸۱۔

(۲) فرینکلن، تاریخ شاہ عالم، ۲۸۱۔

(۳) مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید (دلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰ء)، ۶۶-۶۵۔

(۴) سر سید احمد خان، آثار الصنادید، جلد اول، مرتبہ خلیق انجم (دلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء)، ۲۱۱۔

(۵) حالی، حیات جاوید، ۷۳۔

(۶) حالی، حیات جاوید، ۷۲۔

(۷) حالی، حیات جاوید، ۷۳۔

(۸) مرزا غالب، مثنویاتِ غالب، ترجمہ ظ۔ انصاری (نئی دلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء)، ۱۳۱-۱۳۰۔

(۹) حالی، حیات جاوید، ۷۵۔

(۱۰) حالی، حیات جاوید، ۷۴۔

(۱۱) حالی، حیات جاوید، ۱۱۳۔

(۱۲) سر سید احمد خان، مکتوبات سر سید، ترتیب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، جلد اول (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء)، ۱۲۳۔

(۱۳) سر سید خان، مکتوبات سر سید، ۱۲۴-۱۲۳۔

(۱۴) سر سید خان، مکتوبات سر سید، ۱۲۴۔

(۱۵) سر سید خان، مکتوبات سر سید، ۱۳۴۔

(۱۶) سر سید احمد خان، مقالات سر سید، ترتیب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، جلد اول (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء)، ۲۹۔

(۱۷) سر سید خان، مقالات سر سید، ۳۵۔

(۱۸) سر سید خان، مقالات سر سید، ۵۹۔

کتابیات

حالی، مولانا الطاف حسین۔ حیات جاوید۔ دلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰ء۔

خان، سر سید احمد۔ آثار الصنادید۔ جلد اول۔ ترتیب خلیق انجم۔ دلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء۔

خان، سر سید احمد۔ مقالات سر سید۔ ترتیب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔ جلد اول۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء۔

خان، سر سید احمد۔ مکتوبات سر سید۔ ترتیب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔ جلد اول۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء۔

سر سید احمد خان، دیکھیے خان

غالب۔ مثنویاتِ غالب۔ ترجمہ ظ۔ انصاری۔ نئی دلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء۔

فرینکلن۔ تاریخ شاہ عالم۔ ترجمہ ثناء الحق صدیقی۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس، ۱۹۷۶ء۔